

مکاتیب

(۱)

۲۶ مئی ۲۰۰۵

محترم جناب حافظ عمار خان ناصر

ایڈیٹر الشریعہ، گوجرانوالہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ماہ مارچ ۲۰۰۵ کے تیسرے ہفتے میں دوسرے کاروباری اداروں، ادارہ تحقیقات اسلامی اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ”اجتہاد“ کے موضوع پر اسلام آباد میں ایک سیمینار منعقد ہوا۔ اس کی مختصر سی خبریں تو ملک کے متعدد اخبارات میں چھپیں، لیکن تفصیلی کارروائیاں زیب قمر طاس نہ ہوئیں۔ مولانا زاہد الراشدی بھی اس سیمینار کے اہم شرکا میں سے تھے۔ انھی کے لطف و کرم سے لاہور کے دو روز ناموں، پاکستان اور اسلام میں مولانا موصوف کی تقریر کا مطبوعہ متن میسر آیا۔ روزنامہ اسلام لاہور نے اپنی اسی مارچ ۲۰۰۵ کی اشاعت میں مولانا محترم کا مقالہ بعنوان ”پاکستان میں اجتماعی اجتہاد کی کوششوں پر ایک نظر“ سپرد قلم کیا۔ مذکورہ مقالے میں اس سیمینار کی کارروائیوں کے حوالے سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ریکٹر جسٹس (ر) خلیل الرحمان خان کی ایک تجویز کا ذکر یوں آتا ہے:

”مجھے جسٹس خلیل الرحمان خان کی اس تجویز اور تجویز میں موجودہ معروضی صورت حال کی روشنی میں اہمیت و ضرورت کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آیا کہ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ پارلیمنٹ کے ارکان اور عدلیہ کو قرآن و سنت کے احکام سے باخبر کرنے کے لیے ان اداروں کے ساتھ مستقل تحقیقی شعبے قائم کیے جائیں اور ایک بڑی لائبریری موجود ہونی چاہیے کہ اگر کوئی مسئلہ پارلیمنٹ میں پیش ہو تو ارکان اس سلسلے میں دینی رہنمائی کے لیے اس سے رجوع کر سکیں اور انھیں اس بارے میں بریف کیا جاسکے۔..... اسی طرح عدلیہ میں بھی اس قسم کے شعبوں کا قیام ضروری ہے۔..... جسٹس (ر) خلیل الرحمان نے بتایا کہ بعض مسائل میں جج صاحبان اس لیے بھی صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ان کے پاس دینی طور پر اس مسئلہ میں ضروری معلومات نہیں ہوتیں۔ انھیں اگر صحیح طور پر

بریف کر دیا جائے تو وہ بہتر فیصلے کر سکتے ہیں۔..... جسٹس (ر)خلیل الرحمان خان کی یہ تجویز مجھے بہت اچھی لگی اور اس نشست کے صدر جناب وسیم سجاد نے بھی اس میں دل چسپی لی۔ میرا خیال ہے کہ اگر وسیم سجاد صاحب اس کی اہمیت کو محسوس کر لیں تو وہ اس وقت اس پوزیشن میں ہیں کہ اس پر عمل درآمد کا اہتمام کر سکتے ہیں۔“

’پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے‘ والی اس صورت حال کو دیکھ کر جان و تن وجد میں آ گئے۔ جسٹس خلیل الرحمان مظلہم کی یہ تجویز ایک ایسی نشست میں سامنے آئی جس کی صدارت محترم وسیم سجاد کر رہے تھے۔ محترم وسیم سجاد ملک کی ایک ماریہ ناز شخصیت جسٹس سجاد احمد خان کے صاحب زادے ہیں۔ قانون ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ دشت سیاست کے خارزار کے آبلہ پا ہونے کے باوجود ضمیر کی دولت ان سے وابستہ ہے۔ سینٹ کے چیئرمین رہے اور اس ناتنے کٹی بار ملک کے قائم مقام صدر بھی۔ حکمران طبقات کی باہمی آویزش میں توازن و اعتدال قائم رکھنے میں ابلہ رہے۔ ان تمام اونچی نیچوں پر رہ کر محترم وسیم سجاد نے ملت کی پٹیوں کی ہر سطح بھی دیکھی، پرکھی اور بھگتی ہے۔ یقین ہے وہ اس تجویز سے نہ صرف اتفاق کریں گے بلکہ تن و من سے (دھن سے نہ سہی) اسے آگے بڑھانے میں لگ جائیں گے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ اس تجویز سے وابستہ تمام حضرات کی فکر و نظر میں ’و جعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس‘ کی وسعتیں سمودے۔ آمین

اس غیر معمولی تجویز کی اہمیت و افادیت سے صرف وہی انکاری ہوگا جس کے بارے میں ’الا من سفہ نفسہ‘ کہا جاسکے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی ہوش مندوں کا وجود ہے۔ راقم الحروف کو نہ صرف وقتاً فوقتاً را کین متقنہ سے واسطہ رہا، بلکہ معزز را کین عدالت نیز معروف و کلا صاحبان سے بھی ربط مضبوط رہا کیا۔ فہم دین کے معاملے میں ہو کہ دنیا دانی کی بات ہو، ان معاملات سے وابستہ حضرات کو تہی دامن کا الزام دینا غلط ہے، یوں کہ خود مروجہ عصری نظام تعلیم ہی ملی سوچ، حکمت و دانائی کے معاملے میں کورچٹم ہے، بلکہ صرف ’عمسی‘ ہی نہیں، ’نصم و بکم‘ بھی ہے۔ (ہاں وہ حضرات مستثنیٰ ملتے ہیں کہ جن کے گھرانے مذہبی تعلیم سے بھی آراستہ چلے آئے ہوں، مگر اب یہ صف خاصی الٹ چکی) ظاہر ہے کہ یہ تمام حضرات مروجہ نظام تعلیم کے پروردہ ہوتے ہیں اور ان میں سے جو حضرات خم خانہ مغرب کے جرمہ تعلیم سے بھی فیض یاب ہوئے ہوں، ان کی جدید زندگی، خوب صورتی پر رسولی کی کیفیت سے عبارت ہوتی ہے۔

پھر یہ کہ عصری نظام تعلیم تو انگریز بہادر کے دم قدم سے آیا تھا، ہمارے مدارس کی کیفیت تو گزشتہ کئی صدیوں سے ایسی رہی کہ اب تو رونے کے لیے بھی آنسو کسی سے قرض ہی لینے پڑیں گے۔ فکری جمود اور کم نگہی کی جس منزل پر ہم آج نظر آتے ہیں، وہ آج کی بات نہیں۔ یہ بے ڈول قدم آج سے نصف صدی سے بھی پہلے دیکھے جاتے تھے۔ آخر ’’نہ خود ہیں، نے خدا ہیں، نے جہاں ہیں‘‘ کی فغاں اور ’’زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ‘‘ کا نالہ ایک درد مند نے اسی برصغیر میں یہ دیکھ کر ہی تو بھرا تھا کہ ہم من حیث املت خود داری، خود اعتمادی اور خودی سب کچھ کھوتے جا رہے ہیں۔

آنکھوں نے اس پیاری سرزمین میں وہ منظر بھی دکھلائے جب متقنہ اور عدلیہ کے مقتدر را کین میں بعض

حضرات حیات بعد الموت کو خرافات اور جواب دہی و جزائے اعمال کو دل بہلاو اعلیٰ الاعلان گردانتے رہے۔ ایسے ”معززین“ بھی ملے (اب بھی ملتے ہیں) جنہیں قرآن کریم کی ناظرہ تلاوت بھی نہیں آتی۔ ایک ایسے ملک میں جسے اسلام کے نام پر لاکھوں جانوں کا نذرانہ دے کر حاصل کیا گیا ہو، اگر عصائے قانون سازی اور میزان عدل ان افراد کے ہاتھوں نظر آئے جو

دیر و حرم سے ان کا برابر ہے فاصلہ

جتنے یہاں سے دور ہیں، اتنے وہاں سے دور

کی تصویر ہوں تو پھر حاصل جاں سرکوبی اور سیدہ کو بی ہی رہ جاتا ہے۔ مشکل مگر یہ ہے کہ آدمی کا ایک ہی سر، ایک ہی سینہ ہوتا ہے۔ وہ اسے کتنی بار پیٹے اور کس کس بات پر؟ اب تو وہ منزل آن لگی کہ بنی اسرائیل کو دی گئی اجتماعی سزا (فاسقتلو انفسکم) کے امتثال میں اجتماعی طور پر ’توبوا الی بارئکم‘ کے ساتھ ساتھ کم از کم ایک نسل تک ایک دوسرے کا سر پیٹنے پر مکلف ہونا پڑے گا کہ ہم سب ہی اس صورت حال کے ذمہ دار و قصور وار ہیں۔

”چلو مومنین کرو اب سر سے اونچا ہو گیا پانی“ کی صورت حال ہے۔ گو یقیناً بہت دیر ہو چکی، بریں ہم یہ تجویز نوری رو بہ عمل لائے جانے کی حق دار ہے۔ نہ صرف مقتدہ وعد لیہ کے حوالے سے، بلکہ ایسے تحقیقی مراکز اور لائبریریاں دینی مدارس کے مختلف وفاقوں کے تحت بولبلہ اول ملک کے بڑے تعلیمی مراکز میں بھی ضرور قائم ہونے چاہئیں جہاں مغربی فلسفہ و تہذیب کی پرفریب دیدہ زبہی پر تحقیق ہو سکے اور علاج درد ڈھونڈا جاتا رہے۔ اگر عصر حاضر کے اس شور و محشر کی گونج اب بھی ہمارے وارثین منبر و محراب سننے کے روادار نہیں تو پھر وہ اس دکھیاہری کی طرح جس کی دود دفعہ طلاق ہو چکی ہو اور پھر دود دفعہ بیوگی کے داغ بھی اٹھائے ”ہم تقدیر کو روتا ہے مسلمان تہم محراب“ کے مصداق ’اللہم غرق دیار ہم‘ کے کوسنے ہی تا قیام قیامت دیتے رہ سکیں گے۔

آپ نے وہ مشہور سرائیکی کہادت تو ضروری سنی ہوگی، ”بے عقل نہیں تے موجاں ای موجاں“۔ ہم کرائے کے سپاہیوں کی طرح دوسروں سے کلاشن کوف لے کر ادھر ادھر فی سبیل اللہ فساد کا جہاد ہی کریں گے۔ مغرب کی فکری یلغار زندگی کے ہر میدان میں جتنی مہیب ہے، ہمارا فکری اندھا پن جس قدر روز افزوں ہے، اس حوالے سے مجھے پنجابی کی یہ مشہور کہادت یاد آتی ہے ’اتے کتے ہرناں دا پچھا کرنا‘۔ شاید ہم خود کی طرح ’انہم کاناو قومہ عمین‘ کی منزل پر ہیں۔ وہ عصری تعلیم کے مراکز ہوں یا ایرانی روایات (بلکہ خرافات) گزیدہ دینی مدارس، ہماری ملت وہیں سے یک چشم دانش ور گود لیتی رہی ہے۔ ہم سب اسی جمود رسیدہ، جہل خور سند، دامان دریدہ مگر خود فریب ملت کا حصہ ہیں۔ سچ بولنا ہم نے صدیوں سے چھوڑ دیا تو نتیجے میں سچ سننے کی صلاحیت ہی ندرہی، جبکہ سچ بولنا اور سچ سننا یک جان دو قالب حقیقتیں ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں ہماری ملت کی فکری قیادت اب انھی مہربانوں کے ہاتھوں میں ہے جنہوں نے

یک چشمی کو کامل بینائی و دانائی سمجھ رکھا ہے اور انھی کی نوازشوں سے ہماری ملت کا فکری جہل مستند تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے۔ اس حد تک بھی کہ اب ہمارا ہر طبقہ اپنے سوا ہر دوسرے طبقے کو یا تو مغضوب علیہم سمجھتا ہے یا ضالین گردانتا ہے۔ جسٹس (ر) خلیل الرحمان کی تجویز اپنی جگہ جہاں امید افزا ہے، وہاں ہوش فرسا بھی ہے۔ آپ سوچئے تو یہ مایوس کن حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کے رو بہ عمل آنے میں کئی ایسے مرحلے آئیں گے کہ مردان کا اپنے اپنے گریبانوں کی دھجیاں اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھے ہوں گے۔ وہ ہمارے گریجویٹ اسمبلیوں کے اراکین ہوں کہ وارثان منبر و محراب مفتیان کرام، ان کی معتد بہ تعداد رائج الوقت کسی بھی علمی زبان سے وہ علاقہ بھول کر بھی نہیں رکھتی جو سب سے اہم پہلو ہے۔ بے زبانی یا بد زبانی ہی ان کی زبان دانی سے عبارت ہے۔ پبلک سروس کمیشن کی رپورٹوں ہی کو دیکھ لیجئے، یہ زار و زبوں صورت حال پوری طرح ہویدا ہو جاتی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ احساس زیاں ہی کا ملا جاتا رہا ہو۔ وہ دینی مواد ہو کہ قانونی و فنی، ہمارے ملک کے معروضی حقائق کے تناظر میں ہمیں یا تو عربی میں درکار ہو گا یا انگریزی میں یا پھر پارٹیشن کے بعد سے ملک بدر اردو مرحوم میں، جبکہ صورت حال یہ ہے کہ عصری تعلیم یافتہ ہمارے ایک چشم دانش ور عربی سے اتنے ہی آشنا ہوتے ہیں جتنے کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندے لباس سے۔ اردو سے ایسے گریز پادتنفر جیسے ’کانہم حمر مستنفرۃ فرت من قسورۃ ہوں۔ انگریزی پولیو زدہ اور کلت ماری اور اسی پر نازاں۔

عقل کی موت ، علم کی پستی الاماں لعنت سیر مستی

کی تصویر! آپ ذرا ان حضرات کو ملی سطح پر کسی بھی میدان عمل میں دیکھ تو لیں۔ ادھر ہمارے وارثان منبر و محراب!!

رات بھر واعظ نے کی ہجو بتاں لیکن ایک انداز تحسینی کے ساتھ

انگریزی سن کر ہی جن کی اکثریت کو نسل شرعی واجب ہو جاتا ہے۔ عربی اتنی ہی سیکھتے ہیں جو شاید جنت کی حوریں بولتی ہوں تو ہوں، کیونکہ منتہائے نظر وہی مقام ہے اور اسی غرض سے ہے۔ اور رہی اردو، ذرا کسی دارالعلوم میں با وضو ہی سہی، جانے کی ہمت تو کر لیجئے۔ اردو کا جنازہ آپ کو دارالافتا کے باہر ہی رکھا ہوا بے کفن ملے گا۔ آئیے تو، ذرا باجماعت یہ شعر لاپیں۔

آ عند لیبل کے کریں آہ و زاریاں

دوسرا مصرعہ ہم سب افراد پڑھ لیں گے۔ مگر آپ یقین کیجئے، اس تن ہمہ داغ داغ صورت حال کے باوجود محترم جسٹس خلیل الرحمان کی یہ نوائے دراء، یہ نغمہ جرس، عصر کی اذان کے خاصی دیر بعد دی جانے والی صدائے الصلوٰۃ خیر من النوم ہماری لگ بھگ ساٹھ سالہ حیات ملی کے دھند، دھول اور دھویوں سے آلودہ آفتق پر آس کی ایک کرن ہے اور کام اگر خلوص نیت سے آج بھی شروع کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ رب غفور، عزیز و رحیم ہمیں کچھ اور مہلت دے دیں گے، ورنہ ہم تو بطور ملت خزی فی الدنيا والآخرة کی منزل کے عین نواح پر آن پہنچے ہیں۔

بات نکلے تو بہت دور تک جائے گی۔ اسی گفتگو کے تناظر میں یہ بات میرے لیے بعید از فہم رہتی ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کو، اسلامی نظریاتی کونسل کو، اور خود بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کو باہم فوری طور پر اس منفرد اور عظیم ذمہ داری سے مکلف کیوں نہیں کیا جاسکتا؟ کسی نئی تحقیقاتی لائبریری کا قیام اتنا آسان تو نہیں! کسی بالک کا خواب تو نہیں!! آخر ملک و قوم کے خیر خراج سے قائم یہ ادارے کس مرض کی دوا ہیں اور کس دن کے لیے ہیں؟ ان اداروں کو وجود ملے ربح صدی سے زائد گزر چکی، قوم کے سامنے آج تک ان کی کوئی انقلابی اجتہادی مساعی نہیں آئیں، سوائے چند ترجمہ شدہ کتابوں یا ادھر ادھر کی گٹھ جوڑ سے کی گئی تالیفات کے، جن پر ایک ادارہ بزع خود یہ چھاپ کر کے کہ Not for sale outside Pakistan اپنی کارستانی پر نازاں رہتا ہے، ہٹ دھرم رہتا ہے۔ یہ تمام ادارے عین دار الحکومت اسلام آباد میں براجمان ہیں، قائم ہیں مگر عملاً قائم نہیں۔ ان سب کی اپنی اپنی وقیح لائبریریاں ہیں، تحقیقی شعبے ہیں اور کئی اسکالرز نہ صرف سیاسی اساس پر بلکہ علمی اساس پر بھی وہاں مامور ہیں۔

پاکستان ایک نظریے کا نتیجہ ہے۔ دنیا کی ہر نظریاتی مملکت اپنے فلسفہ حیات کو، اپنے نظریہ حکمرانی و جہاں بانی کو اپنی مطبوعات کی تقسیم کے ذریعے دنیا بھر کو ایکسپورٹ کرتی ہے، جبکہ مملکت خداداد پاکستان کا ایک اسلامی تحقیقاتی ادارہ اپنی گئی چینی مطبوعات کو قیماً بھی ملک سے باہر جانے دینے کا روادار نہیں۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کے سوا اسلام کا وجود اور کہیں نہیں۔ اگر یہ کتابیں وہاں جائیں تو بے حرمتی ہوگی۔ یا پھر کام اتنے نکلے ہیں کہ سکی ہوگی۔ نہیں، بلکہ صرف یہ تاجرانہ سوچ اس سرکاری ادارے میں بھی کارفرما ہے کہ یہ کتابیں صرف ڈالر کی اونچی سطح پر ہی دان کی جاسکتی ہیں۔ بریں عقل و دانش بیاید گریست۔

نیز یہ بات بھی وجہ حیرت رہی کہ اپنے مقالہ میں مولانا زاہد الراشدی نے دینی مدارس کے وفاقوں کے تحت تحقیقاتی لائبریریوں کے قیام کی ضرورت کا، ضمناً ہی سہی، ذکر کیوں نہ کیا؟ اسے جسٹس خلیل الرحمان مدظلہم کی زیر تبصرہ تجویز کے ساتھ تھی کیوں نہ کر دیا؟ حالانکہ مولانا نے محترم نے یہی بات بڑے درد آ شام لہجے میں ایک سرکاری فورم (انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد) کے تحت منعقدہ ایک سیمینار میں اپنے مقالہ بعنوان ”عصر حاضر میں دینی مدارس کے طریق تحقیق و تالیف کا تجزیاتی مطالعہ“ (جولائی ۲۰۰۴) میں کہہ دی تھی۔ واقعہ کل کا ہے، بات اتنی پرانی تو نہیں! اچھی اور ضروری بات تو سورہ حٰن کے تکراری لحن میں بار بار کہی جاتی ہے۔

یہ بات نہیں کہ حاشا و کلا زاہد الراشدی مدظلہم نے اس سے انماض کیا ہو۔ ان سے تو انماض بھی نہیں ہوتا! بلکہ یہ ایک ایسے سہوکارو نا ہے جو کم از کم اسلام آباد کے بے دیوار و بے دروازہ صحرا میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کان پر جوں وہاں رہتی ہے جہاں کان ہونے کا کم از کم شائبہ تو ہو! اسلام آباد کے خود مست قلندروں کو تو سنائی صرف اس وقت دیتا ہے جب وہ فقہ ثانیہ کے صورتی لہجہ میں ہو۔ بھائی عمار ناصر، وہ دن گئے جب صرف فجر میں ’الصلوۃ خیر من النوم‘

کہنے سے لوگ آجاتے تھے، چاہے فجر کی دو فرض میں درود ابراہیمی کی نوبت پر سہی۔ اب تو ہم نیند کے اتنے ماتے ہیں کہ ہر اذان میں اس نعرہ کی ضرورت ہے۔ ہم کسی اور کو جاگنے بھی تو نہیں دیتے۔ اب ہمارے نزدیک نیند انسان کا بنیادی حق ہے اور ہم ٹھہرے ”بنیاد پرست“۔ آخر ہمارے قریب قریب، کوہہ کو قائم خود ساختہ مسلکی دارالافتاء اجتہادی فتویٰ تو دے سکتے ہیں ناکہ طویل نیند اصحاب کھف کی سنت ہے۔

حافظ عمار، سلمم اللہ، کاش کوئی ایسی صورت ہو جاتی کہ آپ جولائی ۲۰۰۴ کے اس مذکورہ مقالے کو ایک بار چھاپ سکتے کہ ملک کی کئی آنکھیں اس نالہ پر سوز کو تحریراً دیکھ لیتیں۔ جو اسے سن نہ پائے، پڑھ ہی لیتے اور عقل کو دعوت دینے کی، ’افلا تعقلون، افلا تذکرون‘ کی تعمیل کو کچھ تو صورت بنتی۔ آخر ’لو کنا نسمع او نعقل‘ کی صورت ابھی تو نہیں آگئی۔ کیا آپ ’انک لا تسمع الموتی‘ کی نوبت کو کاملاً مستولی سمجھ بیٹھے؟

اللہ سائیں سبحانہ زاہد الراشدی صاحب کو اپنی حفاظت میں رکھیں۔ آمین۔ ان کا خیال آتا ہے تو اس عاجز کا حرف دعا اس شعر میں بھی ڈھل جاتا ہے۔ نہ معلوم کس دل جلے کا ہے۔

حشر کے میدان میں کچھ اور وسعت چاہیے

ایک دنیا آ رہی ہے تیرے دیوانے کے ساتھ

میری زباں پر تو یہ دعا جاری ہی رہتی ہے۔ مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا اگر آپ اپنے قارئین کو بھی اس دعا میں شریک ہونے کی دعوت دیں، انھیں یاد دلائیں کہ الم یان للذین آمنوا ان تحشع قلوبہم لذكر اللہ؟

اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

العبدالعاجز

الراجی رحمۃ ربہ العزیز الوہاب

سید عماد الدین قادری۔ کراچی

(۲)

مکرم و محترم حضرت مولانا ابوعمار زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

ماہنامہ ’الشریعہ‘ کا شمارہ مئی ۲۰۰۵ موصول ہوا۔ ایک ہی نشست میں تمام کا مطالعہ کیا۔ ادارہ بہترین تھا۔ محترمہ شاہدہ قاضی کا مضمون ایک وسیع و عریض موضوع کا حامل ہے اور اس میں ابھی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ اگر تاریخ کے کسی پروفیسر صاحب سے نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کی انھی اغلاط کو ’الشریعہ‘ کے ذریعے سامنے لایا جائے تو یقیناً یہ بہت اہم

کام ہوگا، کیونکہ نسیم حجازی صاحب نے جن شخصیات پر یہ تاریخی ناول لکھے ہیں، ہماری تاریخ میں ان کا کردار نہایت روشن اور واضح ہے، لیکن ان سے منسوب بہت سے من گھڑت قصے عجیب و غریب دلائل کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔ ان میں ایک دلیل نسیم حجازی صاحب کے ناول بھی ہیں۔ مذہب و تاریخ سے دور طبقہ انھی پر ایمان رکھتا ہے، حالانکہ یہ درست نہیں۔ (میں نے تاریخ کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ ہماری اکثریت اپنی تاریخ سے ناواقف ہے۔ وہ محض سنی سنائی باتوں کو ہی تاریخ سمجھتی ہے) امید ہے الشریعہ کے ذمہ داران اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

”آرا و افکار“ میں محترم ڈاکٹر امین صاحب نے ایک اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ فی زمانہ جاری حالات و واقعات کے پیش نظر یہ نہایت ضروری اور لازم ہے کہ امت مسلمہ اپنے داخلی جھگڑوں اور رنجشوں کو پس پشت ڈال کر مشترکہ مقاصد کے لیے جدوجہد کرے اور مشترکہ دشمن (یہود و نصاریٰ، امریکہ، برطانیہ، اسرائیل، بھارت وغیرہ) کے خلاف لڑنے کے لیے تمام تر تدابیر بروئے کار لائے۔ یہ موجودہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امت مسلمہ بالخصوص سنی اور اہل تشیع حضرات بھلا کیسے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے طویل مضمون میں جہاں بہت سی تجاویز دی ہیں، وہاں انتہائی اہم نکات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ممکن ہے علماء اہل سنت اور اہل تشیع میں باہمی عناد کی وجہ فقہ جعفریہ کے نفاذ کے لیے چلائی جانے والی تحریک ہو، لیکن علماء اہل سنت کی طرف سے آج تک اس کے خلاف واضح اور موثر آواز نہیں اٹھائی گئی۔ ان کی آواز، ان کی تحریک اس سے کہیں زیادہ بلند، پیچیدہ اور نہایت خطرناک مسئلے کی جانب مبذول رہی ہے اور وہ ہے اہل تشیع کا صحابہ کرام و امہات المؤمنین کے خلاف نہایت ہی نازیبا زبان کا استعمال۔ انھوں نے اپنی سینکڑوں کتابوں میں اس خباثت کا واضح طور پر اظہار کیا ہے۔ وہ اسے اچھا، بہترین اور حق پر سمجھتے ہیں۔ یہ صرف علماء اہل تشیع تک محدود نہیں، اہل تشیع کا ہر وہ فرد جو اپنے مسلک کو سمجھتا ہے، وہ اس بدزبانی کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ شاید ڈاکٹر موصوف نے اہل تشیع حضرات کے شائع کردہ لٹریچر کا کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ ان کی کتابوں میں صحابہ کرام و امہات المؤمنین کے خلاف ایسے گستاخانہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر ایک عام مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ سب کچھ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لے۔ علماء اہل سنت کی ان کے خلاف تحریک اسی کا نتیجہ ہے، وگرنہ مولانا حق نواز جھنگوی، مولانا ضیاء الرحمن فاروقی، مولانا اعظم طارق، علامہ شعیب ندیم وغیرہ کو اس بات کا یقین تھا کہ انھیں جلد یا بدیر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا، لیکن وہ اپنے مٹن پر ڈٹے رہے۔ ان دونوں گروہوں میں بھلا اتحاد و اتفاق کیسے ہو سکتا ہے جب حکومت اس میں مخلص ہی نہیں؟ اگر حکومت چاہے تو شیعہ حضرات کی صحابہ کرام کے خلاف لکھی گئی تمام کتابوں، تقریروں وغیرہ پر مکمل پابندی عائد کر کے اس سنگین مسئلے کو ختم کر سکتی ہے، لیکن ایسا ممکن نہیں۔ ایران بھلا ایسا کب ہونے دیتا ہے؟ اگر اہل تشیع پر یہ پابندی عائد ہو تو پھر ان کے خلاف کسی قسم کی تحریک اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ علماء دیوبند میں باہمی رنجش بجا، لیکن یہ اعزاز بھی انھی کو حاصل

ہے کہ انہوں نے کبھی کسی فتنے، کسی جھگڑے کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا، خواہ بدلے میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اگر آپ غیر جانبدارانہ تحقیق کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ علماء دیوبند انتہائی نامساعد حالات، اپنوں کی چیرہ دستیوں اور عدلی قلمت کے باوجود کفر کے خلاف ہر میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس کے بدلے میں انہیں نقصان پہنچے گا۔ آپ کوئی بھی میدان ان کی موجودگی سے خالی نہیں پائیں گے، خواہ وہ جنگی میدان ہے یا مناظرہ کا میدان یا کوئی اور میدان۔ لہذا یہ کہنا کسی بھی طرح درست نہیں کہ فلاں گروہ نے علماء حق کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ نقصان طالبان نے پہنچایا ہے۔ تو کیا طالبان حق پر نہیں تھے؟

بھارت میں ٹی وی کے جواز و عدم جواز کی بحث پر مبنی مضمون محض انتشار پھیلانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ علماء کے مابین یقیناً ایسے مسائل جنم لیتے رہتے ہیں اور یہ ضروری بھی ہیں کہ اس سے مزید بہت سی نئی راہیں کھلتی ہیں، لیکن یہ کسی صورت بھی مناسب نہیں کہ انہیں صفحہ قرطاس پر رقم کر کے عوام الناس کے سامنے پیش کیا جائے اور خاص طور پر اس صورت میں کہ یہ معاملہ علماء دیوبند کے مابین ہو۔ ہاں، اگر کوئی اور مسلک اس قسم کی حرکت کرتا تو یہ ان کے نزدیک اچھی کوشش ہوتی، لیکن 'الشریعہ' کی یہ کوشش باہمی انتشار کو فروغ دینے کی ایک مذموم حرکت ہے۔ ہمارے جیسے مذہب سے دور لوگ اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر علماء کرام کے خلاف غلط فہم کے خیالات سے اپنے ذہنوں کو بھر لیتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مولوی تو ہمیشہ آپس میں لڑتے ہی رہتے ہیں۔ آپ براہ کرم اس قسم کی اختلافی تحریروں کو شائع کر کے یہ ثبوت نہ دیں کہ آپ بھی روشن خیالی اور اعتدال کی جانب گامزن ہیں۔ یہ کم از کم آپ جیسی شخصیت کو زیب نہیں دیتا، کیونکہ اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب علماء مذہب بیزار طبقہ ہی کی کوشش ہے جیسا کہ آج کل ہورہا ہے۔

باہمی اختلافات پر مبنی تحریروں کے بجائے ایسی تحریروں کو جگہ دینے جن سے مذہب سے دور طبقہ علماء کرام اور مذہب سے قریب ہو۔ وہ یہود و ہنود کی چالوں کو سمجھ سکے۔ نیز اسے یہ بھی معلوم ہو سکے کہ اس وقت علما ان چالوں کے خلاف کیا کیا تدابیر اختیار کر رہے ہیں۔ یہ صرف 'مضرب مومن' یا 'اسلام' کا کام نہیں، 'الشریعہ' جیسے رسائل و جرائد کو بھی پوری طرح مسلح ہو کر اس میدان میں اترنا چاہیے، وگرنہ وہ لوگ جو کسی ایک راہ پر چلنے کے بجائے بہت سی راہوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ درحقیقت ایک نئے راستے کو جنم دیتے ہیں۔ یہاں راستے کا مفہوم آپ بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اللہ پاک آپ کا حامی و مددگار ہو اور آپ کو اپنے نیک مقاصد میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔ آمین

خیر اندیش

انعام الحسن کاشمیری

فیچر رائٹر اردو ڈائجسٹ

۲۱۔ ایکڑ اسکیم سمن آباد لاہور